

تعمیری، اخلاقیات سے بھرپور اور ارتقاء پذیر ہوتی ہے۔ اس فعلیت میں مادی سطح، ذی حیات جانوروں کی سطح پر یا انسانی سطح پر جب کوئی چیز پانچ ہوتی ہے اور اس کے ارتقائی عمل میں رکاوٹ بنتی ہے تو اسے سختی کے ساتھ علیحدہ کر دیا جاتا ہے تاکہ تخلیقی عمل کی ترقی بدستور جاری رہ سکے۔ ارتقاء کی راہ سے ان رکاوٹوں کے دور کیے جانے میں اللہ تعالیٰ کے عنین و غضب اور انتقام کی صفات کا ظہور ہوتا ہے۔ چنانچہ عذاب، استیصال، سادی آفات و کالیف اور قوموں کی سطح پر تباہی و بربادی اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

نالپسندیدگی محبت ہی کا ایک پہلو ہے:

نالپسندیدگی محبت اور چاہت ہی کا ایک پہلو ہے۔ جہاں کہیں محبت کا جذبہ ہوتا ہے وہاں نالپسندیدگی کا جذبہ بھی ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ جذبہ محبت کو اپنے مخالف سے لازمی طور پر یکدھرتی ہے حسن کی ہر صفت کا ایک مخالف ہوتا ہے۔ اس مخالف یا ضد کے بغیر خود اسے مثبت طور پر جانا اور حقیقت کا روپ نہیں دیا جاسکتا ہے۔ برائی، ظلم اور کذب سے نفرت کیے بغیر کوئی شخص اخلاقی فضیلت، انصاف اور حق سے محبت نہیں کر سکتا۔ خالق حقیقی کو جب بعض صفات حزن مثلاً محبت سے متصف کیا جاتا ہے تو ہم ساتھ ہی ائم کو اس کی مخالف اور تضاد صفات سے بھی متصف کرتے ہیں۔ محبت اپنی ضد سے شدید نفرت اور دشمنی کے بغیر سچی محبت نہیں ہوتی۔ تاہم اگرچہ خصامت اور نالپسندیدگی محبت ہی کا جزو ہے، یہ محبت کے اظہار کا منفی پہلو ہے۔ منفی پہلوؤں کا اظہار راہ محبت میں رکاوٹوں کے دور کیے جانے کی صورت میں ہی ہوتا ہے۔ بصورت دیگر یہ پوشیدہ رہتے ہیں۔ جوں جوں جذبہ محبت پروان چڑھتا ہے اور اسی میں بالیدگی ہوتی چلی جاتی ہے۔ نالپسندیدگی کا جذبہ اتنا ہی کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ایسا مقام بھی آجاتا ہے جہاں اس کی ضرورت قطعاً نہیں رہتی۔

غضبِ اوندی کے اظہار کے مواقع:

فداوندی ننگی کی جلد صورتیں انسانیت کی فلاح اور بہتری کے لیے اس دنیا میں اس وقت ظہور پذیر ہوتی ہیں جب کچھ لوگوں کے اعتقادات اور عمل عمومی ارتقاء میں حائل ہوتے ہیں۔

اور ان کا مقصد ان بد اعتقاد اور بد عمل لوگوں کی اصلاح اور خدائی نظم و عمل سے ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے لہذا آیت قرآنیہ :

وَلَنَذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔
(السجدة: ۲۱)

اور ہم ان کو بڑے عذاب سے پہلے قریب کے عذاب کا مزہ بھی چکھاتے رہیں گے، شاید کہ یہ (ہماری طرف) لوٹ آئیں۔

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا۔
(النساء: ۱۲۷)

اگر تم (اللہ کی نعمتوں کا) شکر کرو اور (اس پر) ایمان رکھو تو اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا! اور اللہ تو قدر شناس (اور) جاننے والا ہے۔

فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا قَصَّرْتُمْ ؕ (الانعام: ۴۳)

پھر جب ان پر ہماری (طرف سے) سختی آئی تو وہ کیوں نہیں گر گڑ گڑاتے؟
أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْسِدُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذْكُرُونَ۔
(التوبة: ۱۲۶)

کیا یہ دیکھتے نہیں کہ یہ ہر سال ایک یا دو بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں۔ پھر بھی نہ تو توبہ ہی کرتے ہیں اور نہ نصیحت ہی پکڑتے ہیں۔

اگر ہمارے نظریات اور عملی رویے غلط ہوں اور خدائی سکیم کے ارتقا میں حائل ہوں تو خالق حقیقی کی سزا ان میں بالقویٰ موجود ہوتی ہے۔ غلط سوچ اور بد عملی والے لوگوں کو جلد یا بدیر قوانین فطرت کے ہاتھوں اپنے کیے کی سزا مل کر رہتی ہے اور یوں انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر خدا کی سزا انہیں گھیر لیتی ہے۔ اگر وہ عذاب کے کوڑوں سے آنکھیں کھول لیتے ہیں اور عقیدے اور عمل کی اصلاح کر لیتے ہیں تو خالق حقیقی کی محبت اور انعامات کے مستحق بن جاتے ہیں۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ

غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ (آل عمران: ۸۹)

مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کی اور (اپنی) اصلاح کر لی تو یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ جب افراد اور قومیں اپنی اصلاح کر کے صحیح نصب العین کی طرف رجوع نہیں کرتیں اور اللہ کی طرف سے مہلت بھی ختم ہو جائے تو پھر انہیں مکمل طور پر صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ تاریخ میں بہت سی اقوام کی مکمل ہلاکت کا یہی سبب تھا۔ ان اقوام اور تہذیب کے بانیوں نے غلط نصب العین کے انتخاب اور بد عملیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو اللہ کے عذاب استیصال کا مستحق بنا لیا تھا۔

الَّذِينَ آمَنُوا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ
أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ۔ (طہ: ۳۱)

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اُن سے پہلے کتنی ہی نسلوں کو ہلاک کر دیا تھا کہ اب وہ ان کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گی؟

وَحَرَامٌ عَلَىٰ فِرْعَوْنَ أَنَّهُمْ
لَا يَرْجِعُونَ۔ (الانبیاء: ۹۵)

اور جس بستی (دالوں) کو ہم نے ہلاک کر دیا اُن کے لیے (ہٹنا) محال ہے۔ وہ پلٹ نہیں سکیں گے۔ دنیا میں ان اقوام و مل کے کھنڈرات اور نشانات اب بھی دیدہ بنیا رکھنے والوں کے لیے عبرت کا سامان ہیں۔ اور ہر سوچنے اور غور کرنے والے ذہن کے لیے دعوتِ نیکو کی کہ آخر ان کی تباہی و بربادی کا سبب کیا ہوا۔ اور وہ کیوں نیانیا کر دیتے گئے۔ قرآن بصرحت اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ان کی بربادی غلط نصب العین کو اختیار کرنے اور اعمالِ بد کی وجہ سے ہوئی؛ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِينَ۔ (الزمر: ۲۲)

(اے نبی! ان سے) کہہ دیجئے کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو لوگ (تم سے) پہلے ہو گزرے ہیں اُن کا کیا انجام ہوا ہے۔ اُن میں سے زیادہ تر مشرک ہی تھے۔

جس طرح ایک عقلمند باغبان درختوں کے ارد گرد سے اور پھولوں کی کھیروں سے

جہاز جھنکار کی صفائی اس لیے کرتا ہے کہ زمین، مٹی اور کھاد کی قوتِ مطلوبہ پودوں اور پھولوں کو ملے
اسی طرح خالقِ کائنات اس صفحہ ہستی سے باطل نظریات کی حامل قوموں کو ختم کر کے صحیح نصب العین
کا انتخاب کرنے والے نیکو کاروں کے لیے جگہ بناتا ہے۔ اور انہیں زمین میں تمکن عطا کرتا ہے:

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ

مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَوَارٍ۔ (ابراہیم: ۲۶)

اور کلمہ خبیثہ (باطل نظریہ) کی مثال ایک خراب درخت کی سی ہے کہ زمین کے اوپر ہی سے
اکیڑ کر پھینک دیا جائے۔ اس کو ذرا بھی قرار (وشبات) نہیں۔

ہر قوم کو اصلاح کی مہلت دی جاتی ہے:

غراہ کسی قوم یا تمدن کا نصب العین صحیح ہو یا غلط، اسے اپنی ذہنی، اخلاقی اور مادی صلاحیتوں
کو بروئے کار لانے اور انہیں پروان چڑھانے کی پوری مہلت دی جاتی ہے۔ جب صورت یہ ہو
کہ اس کی تمام تر صلاحیتیں مطلوبہ انسانی ارتقاء میں منفی طور پر حائل ہوں تو پھر خالقِ کائنات کی طرف
سے اس کے خاتمے کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے فطری نوکی تمام صلاحیتیں ختم کر لینے
کے بعد اس میں زوال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ تنزل اور انحطاط کے درجہ بدرجہ مراحل سے گزرتے
ہوئے یہ قوم بالکل صفحہ ہستی سے ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی تہذیب لے لیتی ہے:

كُلًّا نُمِثُّ هَؤُلَاءِ وَهَؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ

وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا۔ (بنی اسرائیل: ۲۰)

(اے پیغمبر! ہم ان کو اور ان کو سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش سے مدد دیتے

ہیں۔ اور تمہارے پروردگار کی بخشش (کسی سے) رکی ہوئی نہیں۔

مَسْتَدْرَجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ۔ (الاعراف: ۱۸۲)

ہم انہیں بتدریج (عذاب کی طرف) اس طرح گھیر لائیں گے کہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی۔

ان آیاتِ قرآنیہ سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ کسی تہذیب کی موجودہ
مخلت و بڑائی غراہ وہ کسی صدیوں پر محیط ہو، اس بات کی ضامن نہیں ہے کہ اس کی نظریاتی بنیادیں

صحت و سلامتی پر مبنی ہیں۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ تَسْتَعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ۔ (ابراہیم: ۳۰)

(اے نبی! ان سے) کہہ دیجئے کہ (چند روز) عیش کر لو، پھر بالآخر تمہارا لوٹنا دوزخ ہی کی طرف ہے)

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلَى مَا مَتَّعْنَاهُ اَنْزِلًا جَانِبَهُمْ (الحجر: ۸۸)

ہم نے ان (کافروں) کی کئی جماعتوں کو جو (متاع دینا سے) بہرہ مند کیا ہے تم اس کی طرف

آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو!

چنانچہ اگر کوئی تہذیب غلط نصب العین اور باطل نظریہ حیات پر استوار ہے تو اسے جلد

یادیر ختم ہی ہونا ہے۔ صرف اسی تہذیب اور قوم کی صلاحیتیں ہمیشہ قائم و دائم رہنے والی ہیں جس کے

نظریات صحیح نصب العین یعنی خدا سے برتر و بزرگ کے یقین پر مبنی ہیں۔ صرف انہی تہذیبوں

میں ارتقاء کے ناقابل شمار اوصاف ہوتے ہیں۔ تمام باطل نظریات رکھنے والی تہذیبیں یکے

بعد دیگرے اس مکمل اور ہمہ گیر عالمی تہذیب کے لیے جگہ بنانے کے لیے معدوم ہو جاتی ہیں اس

کی مثال اس درخت کی سی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری اور مضبوط اور شاخیں بلند و بالا اور

تروتازہ ہیں اور وہ سال بھر ٹہر رہا ہے:

مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا

ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۚ تُؤْتِيْ اُكْلًا كُلَّ حِينٍ

(ابراہیم: ۲۴-۲۵)

بِاِذْنِ رَبِّهَا ط

کلمہ طیبہ (نظریہ توحید) کی مثال ایسے ہے جیسے ایک اچھا درخت جس کی جڑ (زمین میں) جھکی

ہوتی ہو اور اس کی شاخیں آسمان میں ہوں۔ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر موسم میں پھل لاتا رہتا ہو

انسانی خودی کی تمام اچھی صفات، صفاتِ الہیہ کا پر تو ہیں:

خدا نے عز و جل کی اہم ترین صفت کی طرح انسانی خودی کی مرکزی اور اہم ترین صفت

بھی محبت اور رحیمیت ہے۔ باقی تمام صفات صفتِ محبت کے تحت آتی ہیں یا اس کے مختلف پہلو

ہیں۔ چونکہ انسانی خودی کی تمام اچھی صفات کا منبع و سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ہیں

اسی لیے خدا کی صفتِ محبت کی طرح انسانی سطح پر بھی اخلاقی فضائل اور محاسن میں صفتِ محبت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس طور انسان صفاتِ الہیہ ہی کا ایک بہت چھوٹے پیمانے پر عکس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک ہے:

إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ۔

بے شک اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

اور یہی سبب ہے کہ انسان زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور اللہ کے نمائندے اور خلیفہ کی حیثیت میں یہ اس کا فرض منصبی ہے کہ وہ خدائی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنا کردار ادا کرے اور نہ صرف اپنی بلکہ پوری بنی نوع انسانی کی روحانی ترقی کے لیے بھرپور جدوجہد کرے اور کمال کے مطلوبہ نقطہ عروج تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

خلافتِ ارضی کی صراحت مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں ملتی ہے:

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط

(البقرة: ۳۰)

جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

انسان خلافتِ ارضی کے تقاضے پورے کر کے اپنی باطنی صلاحیتوں کو نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ انہیں پورے طور پر ترقی کے مواقع بھی بہم پہنچاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح ان تقاضوں کو پورا کرنا اس کے اپنے فائدے میں ہے۔ خلافتِ ارضی کے اخلاقی اور روحانی تقاضوں کی تکمیل کو خالق کائنات نے اپنی نصرت و مدد سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور صلے کے طور پر نہ صرف روحانی و نفسیاتی بلکہ مادی انعامات کی وعید سنائی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنْ تَتَّخِذُوا لِلّٰهِ یَنۡصُرْکُمْ۔ (ممتدہ: ۷)

اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔

اللہ کی عنایات اور اس کے انعامات حقیقت یہ ہے کہ اس کائناتی ارتقائی عمل ہی کا حصہ ہیں جو خالق کائنات نے مقرر فرمایا ہے اور جو کوئی قوم اور اجتماع انسانی اس عمل کو اختیار کر کے اس کی تقویت کا باعث بنتا ہے وہ ان خود ان سے مستیع ہوتا ہے۔ ان انعامات میں سے

وہ اہم انعام جو باقی سب پر حاوی ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ قومِ رُوتے ارضی پر تکمیل اور غلبہ حاصل کرتی ہے اور مخالفتِ نظریہ یا نئے حیات پر فتح حاصل کر کے دنیا میں مستقل طور پر قائم رہتی ہے۔ اس حقیقت کا بیان مندرجہ ذیل دو آیاتِ قرآنیہ میں ہے :

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ - (الْمُتَّقُونَ : ۸)

اور عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لیے ہے

وَإِنَّمَا أَفْعَالُونَ إِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ - (آل عمران : ۱۳۹)

اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن (صادق) ہو۔

نفرت و مخالفت صرف صحیح محبت کے لیے روا ہے :

نفرت و مخالفت صرف اس وقت جائز ہیں جب وہ صحیح محبت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہوں۔ چونکہ انسان کا اصل مقصد محبتِ الہی ہے، اس لیے جب اس کا جذبہ عشق و محبت صحیح رُخ پر ہوتا ہے تو وہ ہر اس چیز سے محبت کرتا ہے جس سے اللہ محبت کرتا ہے اور ہر اس چیز سے نفرت کرتا ہے جس سے اللہ نفرت کرتا ہے۔ اور اس طرح وہ اس کائنات میں خالقِ حقیقی کے ساتھ شریکِ فاعل کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ ہر اس شخص سے جنگ کرتا ہے جو خالقِ حقیقی کی مجوزہ سکیم میں باغیانہ روش رکھتا ہے۔ یہ باغی حسن، اچھائی اور حق کو پامال کرتے ہوئے اس راہ کو مسدود کرتا ہے جس پر چل کر فائدہ انسانیت اپنی معراج حاصل کر سکتا ہے۔ حق و باطل کی کسی کشمکش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا کہ :

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُّنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ يَدِهِ وَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ وَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ (رواہ مسلم)

تم میں سے جو کوئی بھی کسی بُرائی (کا ارتکاب ہوتے) دیکھے تو اسے اپنے زورِ بازو سے

روک دے، اور اگر یہ نہ کر سکے تو اپنی زبان سے (اس کے خلاف آواز اٹھائے) اور اگر یہ

بھی نہ کر سکے تو اپنے دل سے (اسے بُرا سمجھے)۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ گناہ اور معصیت کو دیکھ کر ایک سلیم الفطرت اور مومن انسان کی حیرت جو ش

میں آتی ہے اور اس طرح خدا اپنے ان بندوں کے ذریعے باطل کی سرکوبی کا بندوبست کرتا ہے:

يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ بِأَيِّدِيكُمْ
(التوبہ: ۱۴)
اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں عذاب دے گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ الْفُرُوفُ
سَبِيلُ اللَّهِ إِنَّا قُلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ط
(التوبہ: ۲۸)

اے اہل ایمان تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (جنگ) کے لیے نکلو تو تم بوجھل ہو کر زمین پر گرے جاتے ہو۔

حق کے لیے کشمکش (جہاد)

حقیقی ایمان والے راست باز انسان کا لازمی شیوہ ہوتا ہے کہ وہ تمام طاغوتی طاقتوں سے نبرو آزما ہوتا ہے اور ان سے مسلسل کشمکش رکھتا ہے۔ اسلامی اصطلاحات میں اس کو کشش اور کشمکش کو ”جہاد“ کہتے ہیں۔ موقع محل کی مناسبت سے یہ کشمکش اور باطل کی مخالفت نسبتاً نرم روپے کے ساتھ اور تشدد آمیز دونوں طرح سے ہو سکتی ہے:

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ط وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى
الْكُفَّارِ رَحِمَاءُ بَيْنَهُمْ -
(الفتح: ۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (مگر) آپس میں رحم دل ہیں۔

وَلِيَعِزُّوْا فِيكُمْ غُلَظَةً ط
(التوبہ: ۱۲۳)

اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔

وَاعْلَظْ عَلَيْهِمْ ط
(التوبہ: ۷۳)

اور ان کے مقابلے میں سختی کا رویہ اختیار کرو۔

وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ط (التوبہ: ۴۱)

اور اللہ کے راستے میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ
بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔
(التوبة: ۱۱۱)

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر خرید لیے
ہیں کہ ان کے لیے بہشت (کی دائمی زندگی) ہو۔

حق کے لیے حمیت اور باطل سے نفرت مرد مومن کی خاص صفت ہے اور واقعہ یہ
ہے کہ اس صفت کو اس کی دوسری صفات بالخصوص محبت و رحمت سے کوئی بُعد نہیں۔ بلکہ
اول الذکر مؤخر الذکر ہی کا ایک پہلو ہے۔ مرد مومن خود ناگزیر حالات ہی میں مسلح تصادم کا آغاز
کرتا ہے اور یہ مرحلہ اس وقت آتا ہے جب باطل کی ریشہ دوانیوں کو ختم کرنا از بس ضروری ہو
جائے۔ چنانچہ جب تک بالفعل حق کو عالمگیر غلبہ حاصل نہیں ہو جاتا، کوئی نہ کوئی باطل نظریہ یا
مادہ پرستانہ نقطہ نظر انسانوں کو گمراہی کی راہ پر چلا کر اخلاقی و روحانی طور پر کمزور کرتا رہے گا۔ جن
ازل کے پرستار اور محبت باطل کے پھیلاؤ کو سختی سے روکتے ہیں۔ جوں جوں دنیا حق کو اپنائتی
چلی جائے گی، نیک اور مومن حضرات کی مخالفت اور نفرت بھی خود بخود کم ہوتی جائے گی۔ خالق
حقیقی سے محبت و عشق کی لازمی شرط عمل اور سعی پیہم ہے۔ اور یہ عمل اور جدوجہد اگر محدود پیمانے
پر رہتا ہے اور اس کا دائرہ وسیع نہیں ہوتا تو اس کے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ ایک غم
مضم اور جذبہ جہاد رکھنے والا مومن اپنی خودی کے مزید استحکام کے لیے اپنے نصب العین کو
حاصل کرنے کی بھرپور اور وسیع پیمانے پر کوشش کرتا ہے۔ اس کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ یہ
نصب العین اور اس کا حصول اسے ہر دوسری چیز پر مقدم ہوتا ہے اور زندگی کے تمام مشاغل
اسی حوالے سے طے پاتے ہیں۔ اگر وہ جزوی طور پر کچھ دوسرے نصب العینوں کو بھی محبوب
رکھتا ہے تو اس کے قلب و دماغ کی کچھ صلاحیتیں ان کے لیے بھی استعمال ہوتی ہیں اور ظاہر
ہے کہ صحیح نصب العین کا حق اس صورت میں کماتھا، پورا نہیں ہو سکتا۔ یعنی ایسے شخص کی فلاح و اربا
منقسم ہو کر خود اس کی ذہنی یکسوئی ختم کر دیتی ہیں۔

جہتی خواہشات کی مناسب تکین انسانی ارتقا میں مدد ہے

صحیح اور اعلیٰ ترین نصب العین کی خدمت ہی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک صاحب ایمان اپنی فطری خواہشات کی مناسب تکین کے لیے تگ و دو کرے۔ ان فطری خواہشات کا تعلق نہ صرف اس کی زندگی کے بقا سے ہے، بلکہ یہ اس میں اور اپنا نئے نوع میں خالق حقیقی اور نصب العین سے محبت و عشق کی افزونی کے لیے بھی ضروری ہیں۔ لیکن چونکہ ان فطری جہتی خواہشات کی تکمیل لذت کا باعث بھی ہوتی ہے اور ان میں صحیح نصب العین کے تقاضوں سے بالعموم تصادم کا رجحان بھی ہوتا ہے، اس لیے ایک صاحب ایمان شخص کو ان اندھی اور بگ ٹٹ خواہشات کو ایک مناسب حد تک پورا کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ ماہ رمضان کے روزے اسی قسم کی تربیت کے سلسلے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک ماہ کے دوران روزے انسان کو اپنی خواہشات اور جہتی تقاضوں کو کنٹرول میں رکھنے کی زبردست مشق فراہم کرتے ہیں۔ لیکن یہ امر مسلم ہے کہ اپنی جگہ کوئی بھی جہتی خواہش غلط یا بے مقصد نہیں ہے۔ اس لیے ان کو مکمل طور پر اور مستقلاً دبا یا قطعاً نامناسب ہے۔ ہر جہتی خواہش کا بقائے انسانی اور عمومی ارتقاء میں اہم کردار ہوتا ہے اور صرف صحیح نصب العین کا تصور ہی ان کی جائز حدود کا تعین کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام دنیا سے قطع تعلق، شادی بیاہ نہ کرنا اور عائلی زندگی سے اجتناب اور دوسری سماجی مشغولیتوں سے کنارہ کشی کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ جیسا کہ درج ذیل حکم سے معلوم ہوتا ہے اسلام میں ربانیت کی کوئی گنجائش نہیں:

لَا دَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ۔

اسلام میں کوئی ربانیت نہیں ہے۔

قرآن مجید اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ عیسائی راہبوں نے نفس کشی کے جو طریقے اور ربانیت کی جو روش اختیار کی، وہ ان کی اپنی ایجاد تھی۔ ان کے نبی نے انہیں اس کی تعلیم نہیں دی تھی۔ انہوں نے اپنے طور پر عبادت اور زہد و تقویٰ میں غلو کرتے ہوئے اس

پرعت کو مشروع کیا:

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهُمَا مَا كَتَبْنَا عَلَيْهِنَّ (الحديد: ۲۷)

اور رہبانیت کی تو انہوں نے خود ایک نئی بات نکال لی، ہم نے اسے ان پر واجب نہیں کیا تھا۔
فطری خواہشات، تقاضے اور جبلتیں خالق حقیقی کے نظم و مخلیق کا اہم حصہ ہیں اور ان کا مقصد انسانی بقا و ارتقاء میں مدد ہے۔ چنانچہ جبلتوں کا یوراکرنا خالق حقیقی کے پروگرام میں معاونت کے مترادف ہے اور ان کی تردید یا مخالفت خدا کے عمل تخلیق اور ارتقاء کی مخالفت۔
جملہ انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد یہ نہیں رہا کہ وہ انسانوں کو اپنی فطری اور جبلتی خواہشات کو کچلنا اور دبانا سکھائیں، بلکہ ان کا مقصد بعثت انسانوں کی جبلتی خواہشات اور فطری تقاضوں کی تسکین کو صحیح نصب العین کی حدود میں مقید کرنا تھا۔ تاکہ وہ نصب العین کو نقصان کی بجائے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر پورا کریں اور اس کے حصول میں ممد ہوں۔ جبلتی قوتوں کا صحیح اور جائز استعمال نہ صرف تسکین ہے انسانی معاشرے کی ترقی اور نمو میں یہ انتہائی مثبت اہمیت کی حامل ہیں۔

عالمی زندگی کی اہمیت اور اغرہ و اقارب کے حقوق

جبلتی تقاضوں میں سے صنبی جذبہ اسلام میں مناکحت کی شکل میں بھرنے پر تسکین حاصل کر سکتا ہے۔ نکاح سے ایک مرد و دوسروں سے کسی رشتے اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً وہ بیٹا، بھائی، داماد، شوہر، باپ، چچا، بھروسہ وغیرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح عورت، بیٹی، بہن، بہو، بیوی، ماں، خالیا، چچی، خوشدامن وغیرہ ہوتی ہے۔ ان تمام رشتوں کے اعتبار سے ہر مرد اور عورت کے صحیح نصب العین کے ضمن میں متعدد حقوق و فرائض ہوتے ہیں۔ بالخصوص فرائض کی بجا آوری ایمان کے تقاضوں میں سے اہم فرض ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک مومن کو کوئی بھی اچھا اور نیکی کا کام اپنے قریب ترین عزیز و اقارب سے شروع کرنا چاہیے۔ جو بھی خونی طور پر زیادہ قریب ہے اس کا حتیٰ بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔ تاہم یہ خیال رہنا چاہیے کہ ایک ہی درجے کے قرابت داروں کے درمیان کوئی فرق و تفاوت نہ ہو اور اس میں کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ چنانچہ دین نے اس معاملے میں بھی فطری

تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ چونکہ انسان طبعاً اپنے قریب ترین خونی رشتہ داروں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے انہی کے حقوق بھی زیادہ رکھے ہیں۔ ایک سلیم الفطرت اور نیک انسان کا دائرہ خیر قریبی عزیزوں سے بڑھ کر پوری انسانیت کو محیط ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ ایشار اور قربانی کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کرتا ہے۔ ہمارے دین کی تعلیمات میں قرابتوں کے حقوق کے بارے میں بڑی تاکید ملتی ہے۔ چنانچہ قریبی رشتہ داروں اور اہل خانہ سے محبت اور اچھے سلوک کی تعلیم پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے متعدد اقوال میں دی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

إِبْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ (بخاری)

(فرج کرنے میں) اُن سے ابتدا کرو جو تمہارے زیرِ کفالت ہیں۔

اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی خونی رشتے جب حق اور انصاف کے تقاضوں سے متصادم ہوں تو ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلمانوں نے دین حق کے سلسلے میں کسی کی پرواہ نہیں کی۔ قریب ترین اور محبوب ترین عزیزوں کی محبت بھی دینی تقاضوں کے تابع رہی۔ دین کا غلبہ اور صحیح نصب العین سے سچی محبت کا اظہار اس کے بغیر ممکن بھی نہ تھا۔ (جاری ہے)

بقیہ: درس سورۃ محمد

بلکہ یہی قول معروف ہو کہ: سَتَعْنَا وَاطْعُنَا۔ زیرِ مطالعہ آیت میں آگے فرمایا: فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ ”جب ایک بات قطعی طور پر طے ہو جائے فیصلہ ہو جائے“ یہ ہے دوسری مشاورت کا قصہ، جس کا حوالہ دیا جا رہا ہے۔ ٹھیک ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے سامنے بات رکھ دی تھی جس کے نتیجے میں طے ہو چکا ہے کہ لشکر کا رخ کیا جائے گا۔ تو اگر کسی کی رائے اس اجتماعی فیصلہ کے خلاف ہو تب بھی نظم اور اجتماعیت کا تقاضا یہ ہے کہ اب کسی قسم کا کوئی تردد و تذبذب نہ ہو، اسے پوری خوش دلی سے قبول کیا جائے اور اللہ کے بھروسہ پر اسی کے مطابق عمل و اقدام کیا جائے فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ○ فیصلہ ہو جانے کے بعد لوگوں کے لئے خیر اور بھلائی کا راستہ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کو پورا کرنے میں ہی ہے۔ لہذا فرمایا گیا کہ ”اگر اس وقت وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلے تو انہی کے لئے بہتر تھا“ بَارَكَ اللَّهُ لِي فِي الْقُرْآنِ الْعَظِيمِ وَنَفَعْنِي وَايَاكُمْ بِالْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ (جاری ہے)

(آخری قسط)

مولانا فراہی کی تفسیر سورۃ الفیل

ایک جائزہ

(بشکریہ ماہنامہ "حیات نو" بھارت)

قرآنی الفاظ اور اسالیب سے استشہاد

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے لفظ "ترمی" سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ترمی کا فاعل ہمارے نزدیک قریش ہیں جو "آلم ترم" کے مخاطب ہیں۔ فعل "ترمی" چڑیوں کے لئے کسی طرح مزدور ہے ہی نہیں۔ چڑیاں اپنی چونچوں اور چنگلوں سے سنگ ریزے تو گرا سکتی ہیں لیکن رمی نہیں کہہ سکتے۔ رمی صرف اسی صورت میں ہوگی جب پھینکنے میں بازو یا ناخن کا زور استعمال ہو یا ہو اسکے تیز دند تھپڑے اس کے ساتھ ہوں۔" ۳۲

مولانا اصلاحی کے آخری جملے سے خود ان کے اعتراض کی تردید ہو رہی ہے۔ ابو نفیس بن اسلمت شیرازی جاہلی کے جو اشعار اوپر گزرے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ "جس وقت خدائی فوجوں نے لشکرِ ابرہہ کو پساکیا اس وقت تند تیز ہوا بھی چل رہی تھی" اس لئے چڑیاں جب اوپر سے پتھر گراتی تھیں تو تیز ہوا کی وجہ سے ان میں رمی کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ مشہور محدث ابن ابی حاتم کی نقل کردہ روایت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے:

"عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ جب ابرہہ کا لشکر مکہ کی جانب بڑھا تو تیز ہوا چلی اور ہندو کی جانب سے ہندوؤں کے غول اڑتے ہوئے لشکر پر پھل گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں ہندوؤں کا زبردست لشکر پرے کے پرے باندھے ہوئے ہے۔ ان کے منہ اور ان کے دونوں پنجوں میں سنگ ریزے تھے۔ انھوں نے آواز کی اور پھر لشکر پر سنگ ریزے مارنے لگے۔ ساتھ ہی تند تیز ہوا چلنے لگی جس نے اس سنگباری کو لشکر کے لئے مصیبتِ عظمیٰ بنا دیا۔" ۳۳